برق و باراں
احسن احمد اشک
قرآن منزل ـ ڈھاکہ

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

طبع اول

تعداد اشاعت پانچسو

مطبوعہ ربانی پریس نمبر ۳۴ کولن اسٹریٹ کلکتہ

یہ میری چند منتخب نظموں کا پہلا مجموعہ ہے اور یہ وہی نظمیں ہیں جو مجھے زیادہ پسند ہیں۔
لوگوں کو میرے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ کوئی مجھے "ترقی پسند" سمجھتا ہے اور کوئی "قدامت پرست"
درحقیقت میں کوئی بھی نہیں۔ صرف شاعر ہوں اور بس۔

دہقان اور مزدور میری شاعری میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی
وجہ یہ ہے کہ میں بنگالی ہوں اور بنگالہ گذشتہ نصف صدی سے طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونیوالی تحریکوں
کا گہوارہ رہا ہے۔ بچپن سے لیکر اب تک میری زندگی یا تو کلکتہ کے ہنگامہ خیز کارخانوں کے ارد گرد
یا بنگالہ کی رومان انگیز دیہاتی فضاؤں میں۔ چنانچہ بنگالے کی "رومانیت" اور "مشرب بغاوت"
دونوں ہی میری شاعری پر کافی اثر انداز ہیں۔

سرورق میرے عزیز دوست مسٹر زین العابدین۔ مشرقی پاکستان کے مشہور آرٹسٹ
کے موقلم کی جنبش کا نتیجہ ہے۔ شکریہ کے چند رسمی الفاظ ان کی محبت اور دوستی کا بدلہ ادا نہیں کرسکتے
اپنی نظم "نالہ جرس" کے سلسلہ میں میں ریڈیو پاکستان کا مشکور ہوں کہ اس نے مجموعے
میں اسے درج کرنے کی اجازت دے دی

اس مجموعے میں کتابت کی غلطیاں ہیں جنہیں دیکھ کر تکلیف تو ضرور ہوتی ہے،
مگر مجبوری، کیا کیا جائے۔ کتاب کلکتہ میں چھپی اور وہ بھی میری عدم موجودگی میں۔ غلطیوں کی
تصحیح غلط نامے سے ممکن نہیں مگر اس کے سوا اور چارہ بھی نہیں۔

"مہاجر کی ایک رات" صفحہ ۲۰ سے شروع ہوتی ہے۔ اس نظم کے پانچ حصے ہیں۔
پہلے حصے میں ۸ دوسرے میں ۵ تیسرے میں ۶ چوتھے میں ۱۳ اور پانچویں حصے میں ۱۰ شعر ہیں۔
اس تقسیم کے بغیر نظم کے سمجھنے میں دقت ہوسکتی ہے۔

(اشک)

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷	۳	ایک منظر	ایسا منظر
۱۴	۱۸	امیدوں کا کنول	امیدوں کے کنول
۱۵	۶	جھونپڑوں میں	جھونپڑوں کو
۲۵	۱	چڑھائے تیوریاں	چڑھائے ہے تیوریاں
۳۲	۱	تدبیریں	تعبیریں
۳۴	۳	مجھے	اسے
۳۷	۸	پریشانی	پشیمانی
۴۶	۴	قسم اس	قسم ہے اس
۵۰	۷	منظر	منزل
۵۳	۱	دفتر	دختر
۶۰	۳	گناہ کے آستین ہون	گناہ کی آستین ہو
۶۸	۲	بستی	بنتی
۶۸	۷	دیود	دیوے
۸۱	۱	روا	ادا
۸۴	۴	جرم وفغاں	جرم فغاں
۸۸	۲	ہوس کے	ہوس کی

برق و باران

فہرست

انتساب :-

فکر و نظر کے ان گراں قدر

لمحات کے نام :-

جو برادرِ محترم حضرت جمیل مظہری کی صحبت میں بسر ہوئے۔

اشک

پیش لفظ

پروفیسر "احسن احمد اشک"، شعراء کے جنگل سے الگ تھلگ رہا کئے ہیں۔ وہ ٹٹی کے اوجھل شکار کھیلتے ہیں لیکن جب تیر مارتے ہیں تو کاری ہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ رسمی شاعری کے وہ قائل نہیں ہیں غائر نظر اور حساس دل رکھتے ہیں جب کوئی ایک منظر پیش نظر ہوتا ہے جس سے اُن کا دل متاثر ہوا ہو تو ایک آواز اُن کے دل سے نکلتی ہے جو ترنم میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ الفاظ دلکش ہوتے ہیں۔ اور پر تاثیر۔ ترکیب الفاظ میں ایسی رنگینی ہوتی ہے کہ سامع کا قلب کیفیتوں میں کھو جاتا ہے۔ اشک "ترقی پسند" شاعر کی حیثیت سے اپنے کو پیش نہیں کرتے ہیں لیکن اُن کا کلام صحیح معنوں میں مدارج ارتقاء طے کرتا رہتا ہے۔

اُن کی نظموں کا موضوع بیشتر وہ دکھ ہے جو انسان کے ہاتھوں انسان کو پہونچتا ہے، دکھے ہوئے دلوں سے اُن کی ہمدردی پر زور طریقے سے نمایاں ہوتی ہے اور اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اشک کا شغلہ شعر و شاعری نہیں ہے وہ اسی وقت کچھ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں جب اُن کا دل کسی ستم زدہ

کی فریاد سنکر بے چین ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُن کا مجموعۂ کلام بہت ہی مختصر ہے اور
میں تو یہی کہوں گا کہ اختصار ہی اس کی بہترین صفت ہے۔

اشک کبھی کبھی غزل بھی کہتے ہیں۔ اُس میں بھی اُن کی خصوصیتیں نمایاں طور
پر نظر آتی ہیں یعنی ایک گہرا سوز و گداز اور ایک رقت آمیز ترنم۔ مجھے یقین ہے کہ
یہ مختصر مگر پر اثر مجموعۂ کلام اہل دل اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرے گا۔

۲۱ جون ۱۹۴۹ء

رضا علی وحشت

تعارُف

ہمارے ملک میں شاعری کو ایک تفریحی مشغلے سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی گئی چنانچہ ارباب علم وفضل سنجیدگی کے ساتھ کبھی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ اور ان بزرگوں میں سے کسی نے کچھ کہا بھی تو "بطور تفنن"۔ "تذکرہ نویسوں نے انُ کی شاعری کا ذکر کیا تو شاعری کو انُ کی شان اور مرتبہ سے فروتر بتایا۔ عموماً شاعری کو "تضیع اوقات" کا مترادف سمجھا گیا اور آج بھی یہی حال ہے۔

شاعری اور زندگی کے درمیان قدرت نے جو ایک گہرا تعلق قائم کیا ہے لوگوں نے عام طور پر اسے سمجھا ہی نہیں اس بنا پر وہ شاعری کی اہمیت اور اسکی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ نہ کرسکے۔ لازماً شاعری اس توجہ سے محروم رہ گئی۔ جس کی وہ مستحق تھی۔

موجودہ زمانے میں مادّی افادیت کا نظریہ جو مغربی تہذیب و تمدّن کے اثر سے ہماری زندگی پر چھا گیا ہے اور بھی شاعری سے بیزاری کا سبب ہوا ہے۔ ہم صرف اتنا ہی سوچتے ہیں کہ شاعری کرنے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ کچھ تنخواہ بڑھ جائے گی؟ کوئی عہدہ یا اعزاز ملے گا؟ آمدنی کی کوئی نئی شکل نکل آئے گی؟ زندگی کی آسائشوں میں کچھ اضافہ ہو جائے گا؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو پھر شاعری کا حاصل؟ تضیع اوقات۔ شاعر ہونے سے تو بہتر ہے کہ انسان موٹر ڈرائیور ہو جائے۔ محنت کا

کچھ تو معاوضہ ملے گا۔ زحمت بیکار تو نہ جائے گی۔ اور جب وقت ہم زندگی کی آسائشوں کا تصور کرتے ہیں تو ہمارا خیال مادیات کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ لذیذ کھانے زرق برق لباس، عالیشان کوٹھیاں، شاندار موٹریں، بہت سے نوکر چاکر اور حیوانی خواہشات کی تسکین کا وافر سامان، بس۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان فقط جسم کا نام نہیں۔ حیوان اور انسان کے درمیان امتیاز پیدا کرنے والی ایک اور چیز بھی ہے جسے کوئی ادراک و تعقل، کوئی دل و دماغ، کوئی وجدان اور کوئی روح سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو مانتے ہیں اور ماننے کے سوا چارہ نہیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جسمانی غذا کے ساتھ ساتھ ہمیں دماغ یا روح کی آسودگی کے لئے بھی ایک لطیف و نفیس غذا کی ضرورت ہے۔ ہر قسم کی جسمانی آسائش میسر آجانے کے بعد بھی ہماری روح کسی چیز کے لئے تشنہ و گرسنہ رہتی ہے اور اس تشنگی کی تسکین جیسی شعر سے ہوتی ہے کسی دوسری شئے سے ناممکن نہیں۔ شعر ہمیں ایک سرمدی سکون و سرور بخشتا ہے۔ حقیقی مسرت اسی کا نام ہے۔ اور یہ حقیقی مسرت، یہ دل کا سکون اور یہ روح کی آسودگی فقط مادی وسائل کسی طرح مہیا نہیں کر سکتے۔

جن لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا ہے وہ شاعری کی عظمتوں اور اس کے لامحدود امکانات کے قائل ہیں اور اپنی صلاحیت کے مطابق خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے شعر کی صورت میں روحانی تسکین کا سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ محض تفریحاً یا تقلیداً شاعری کرتے ہیں وہ اس بحث سے خارج ہیں۔ اس لئے کہ وہ آج تک کوئی ایسی چیز پیش نہیں کر سکے نہ کر سکتے ہیں جو کوئی مستقل حیثیت یا پائدار زندگی رکھتی ہو۔

البتہ جنھوں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں جذبات کی طغیانی کو محسوس کیا ہے۔ جو اپنے یاد دسردوں کے قیمتی تجربات سے بہ شدت متاثر ہوئے ہیں۔ جن کے افکار و خیالات غائر نظر اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہیں اور پھر وہ اپنے اعلیٰ و قیمتی تجربات کو ایک دل نواز پیکر عطا کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں انھوں نے شعر کہکر یقیناً انسانیت پر احسان کیا ہے۔ انسانیت کے ان محسنوں کے مدارج ہیں۔ ان مدارج کی تعیین اس وقت میرے پیش نظر نہیں۔ مگر اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر احسن احمد اشک کو بھی ان کی شاعری کی بدولت اس زمرے میں شامل کرنا پڑے گا۔ ان کے مقام کا تعیین ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد آپ خود کر سکیں گے ہیں صرف چند اشارے کافی سمجھتا ہوں

اشک غزلیں بہت کم کہتے ہیں۔ مگر جو کچھ کہتے ہیں اس میں صداقت و خلوص ضرور ہوتا ہے۔

مرے دل کی تمنا طرۂ دستار گلچیں ہو اور اس پہ یہ قیامت وہ دعا مانگے باغباں مجھ سے

اشک نے ان دو مصرعوں میں نامرادی کی ایک پوری داستان بیان کر دی ہے، بلبل کا محبوب پھول ہے۔ گلچیں نے وہ پھول توڑ لیا اور اسے اپنی دستار کی زینت بنا لیا اس ستم ظریفی کو تو دیکھو کہ اب نامراد بلبل سے داد چاہی جاتی ہے کہ دیکھو ہم نے کتنا خوبصورت پھول چنا۔ اور یہ ہماری دستار میں کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ استعاروں کے حجابات اٹھا کر دیکھئے تو ایک دلدوز حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ جس سے متاثر نہ ہونا ایک معمولی انسان کے بس کی بات نہیں۔

ہم اپنا دکھڑا سنا رہے ہیں وہ بیٹھے سن بھی رہے ہیں لیکن
کچھ اس طرح مسکرا رہے ہیں کہ جیسے ان کو یقین نہیں ہے

نفسیات کا کتنا گہرا مطالعہ ہے۔ دردناک واقعات سنکر انسان صرف اسی حالت میں مسکرا سکتا ہے جب کہ وہ انہیں محض حکایت و افسانہ سمجھے۔

شاعر کو اپنے محبوب کے طرزِ عمل سے اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ محض دنیا ساز اور غرض کا بندہ ہے۔ اس کی دوستی میں صداقت و خلوص کا نام نہیں۔ شاعر کا دل بار بار اسے متنبہ کرتا ہے کہ ایسے خود غرض انسان سے تعلقات رکھنا محض نادانی ہے۔ مگر اسپر بھی وہ اپنی طرف سے ترکِ تعلق پر آمادہ نہیں۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح بنا ہے جاتا ہے کیونکہ اسے خود اپنی وفا کا پاس ہے۔ اسے شرم آتی ہے کہ جسے اپنا کہا، اپنا سمجھا، اپنا بنایا آج اس کی بیوفائی کی بنا پر اس سے رشتہ محبت قطع کر لیا جائے اور پیمانِ دفا توڑ لیا جائے۔ اس پوری روداد کو اشک نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ صرف چند لفظوں میں کہدیا ہے،

دل تو چونک چکا تھا پہلے
مجھ کو وفا کے پاس نے مارا

غزل کے چند شعر اور سنئے :۔

جام اس کا تھا، شراب اس کی تھی، محفل اسکی
اشک کچھ سوچکے ساقی سے تقاضا کرتے

دو دھڑکتے دل کہانی کہہ رہے تھے شوق کی
خامشی تھی داستاں در داستاں کل رات کو

کوشش یہ ہے کہ ایک نیا راستہ بنے
چلتے ہیں ہٹ کے رہگذرِ کارواں سے ہم

اشکؔ کی نظموں کے عنوانات اگرچہ گوناگوں ہیں اور موضوعات بھی مختلف ہیں لیکن ان کے بعض خیالات و افکار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے کسی نہ کسی طرح اُن کی اکثر نظموں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی ہے۔ طبقاتی کشمکش سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں۔ غریب دہقان اور مفلس مزدور کی زبوں حالی دیکھ کر ان کو روحانی اذیت ہوتی ہے اور "قسمت کے چہیتے بیٹوں" کے خلاف ان کے دل میں جذبۂ انتقام بھڑک اٹھتا ہے:۔

اے کاش زمانے میں چلتی اک ایسی تند و تیز آندھی
پرہول وجنوں انگیز آندھی! خوں ریز و تلاطم خیز آندھی
دستاریں سروں سے گر گر کے تودوں میں خاک کے مل جائیں
قصر سرمایہ داری کی سنگیں بنیادیں ہل جائیں
غارت ہو جاتی یہ بستی خونخواروں کی حیوانوں کی
عالم ہوتا مزدوروں کا، دنیا ہوتی دہقانوں کی

دہقان کی زبوں حالی کا نقشہ وہ نہایت موثر انداز سے کھینچتے ہیں:۔

وہ دیکھو ہو رہی ہے روشنی ایوانِ دولت میں
لہو دہقان کا جلتا ہے چراغِ بزمِ عشرت میں

غور کیجئے تو ایک جہانِ معنی ان دو مصرعوں میں پنہاں ہے اور پھر اندازِ بیان کس درجہ حسین اور تشبیہہ کتنی تازہ اور خوبصورت ہے۔ ایسی چیزیں اشکؔ کی نظموں میں آپ کو جابجا ملیں گی۔

اشکؔ کو بجھے دلوں میں ولولہ پیدا کرنے اور انھیں عزم و عمل کی ترغیب

دیتے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ ان کا شاعرانہ انداز بیان عموماً برقرار رہتا ہے ا
ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار محض وعظ و تلقین بنکر رہ جائیں :۔

پر پرواز ہے کیا شدت عزم پرواز
گرمیٔ شوق سے سامانِ سفر پیدا کر
لے کے نشانِ حریت تیز چل اور تیز چل
باغ و بہار حسن پر ڈال نگاہِ سرسری
سنتِ رفتگان کو چھوڑ جادۂ نو تلاش کر
شوق ہے خضر راہ خود شوق کی کرنہ رہبری
دود چراغ عقل سے ایک نئی سحر بنا!
قسمت دہر ہے سیاہ صورت زلف کافری
مثلِ غبار راہ چل وقت کے قافلے کے ساتھ
تیرے لئے رکے گی کیوں گردشِ چرخ چنبری

شعراء جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے اور قدرت کے اس عطیہ کو یونہی رائگاں کھوتے ہیں ان پر انتک نے "تلخ حقیقت" میں ایک نہایت لطیف طنز کی ہے۔ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر میرے وجود میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور اگر میرا وجود ایسا ہی ضروری تھا تو کاش قدرت نے مجھے اس قابل بنایا ہوتا کہ میں کسی کے کام آسکتا۔

گھروں میں پاس کے کرتا امیدوں کا کنول روشن
کسی بیمارِ غم کا مونس شام بلا ہوتا ؛

ڈبو کر کشتئ سرمایہ داری قعر دریا میں :
میں مغروروں کی حسرت کا تماشا دیکھتا ہوتا
بہشتِ قیصر و فغفور کے سنسان کھنڈروں میں
تباہی اور بغاوت کا ترانہ گا رہا ہوتا
غریبوں کے محلوں میں چراغِ رہگذر بن کر
اندھیرے جھونپڑوں میں بھیک اپنی دیر رہا ہوتا

اور خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے :۔

مگر افسوس فطرت نے مجھے شاعر بنا ڈالا
نہیں تو اشک اپنی آرزوؤں کا خدا ہوتا

کیا شاعر اس لئے بنا ہے کہ وہ زندگی بھر صرف حسین لفظوں سے کھیلتا رہے اور کوئی مفید کام سرانجام نہ دے سکے ؟

اشک کی بعض نظمیں خالص غنائی انداز کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ اس طرف زیادہ توجہ کرتے تو ان کی تخلیقات اس رنگ میں ایک نشان امتیاز پیدا کر لیتیں ۔ اس ضمن میں اُن کی نظم " رقص ،، خاص طور پر قابل مطالعہ ہے ۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اشک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظم چاہے کہیں سے شروع ہو اور اس کا عنوان خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کی تان اکثر " دہقان" پر ٹوٹتی ہے ۔ اور اس سے اُن کے مخصوص رجحانات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ۔

ایک نظم کا عنوان ہے " ہلال عید ،، اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے

فضاؤں کے سمندر میں تلاطم ہو گیا بر پا
مہِ نو کی سنہری ناؤ اچھلی کھا کے ہچکولا!
نظر بچی کئے محمل سے باہر آ گئی لیلےٰ
تبسم آتے آتے رک گیا شرما گئی لیلےٰ

آغاز سے انداز بتیا رہا ہے کہ وہ منظر کشی پر آمادہ ہیں اور ایسا ہی انھوں نے کیا بھی ہے۔ ہلال عید کی تشبیہات نظم کرنے کے بعد وہ عید کی مسرتوں کا ذکر کرتے ہیں اور پھر یکا یک ایک موڑ آتا ہے اور ان کے خیالات کا دھارا بالکل دوسری جانب پھر جاتا ہے۔ ترانہ مسرت یک بیک پامال انسانیت کا نوحہ بن جاتا ہے اور خاتمہ پر وہ ہلال عید سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

کہ رونق تجھ سے ہو سکتی ہے عشرت کے دیار و نہیں
مگر کیا خاک ہو گی روشنی دل کے مزار و نہیں

الغرض اشک کے کلام میں تاثیر بھی ہے اور حسن بھی، غور و فکر کے آثار بھی ہیں اور عزم و عمل کی ترغیب بھی، پاکیزہ اخلاق اور بلند کردار کے عناصر بھی ہیں اور روح کی تسکین کا سامان بھی۔ اس بیان سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ آپ اشکؔ کو فرید عصر اور یگانہ روزگار سمجھیں۔ نہ وہ ایسے ہیں نہ میں انھیں ایسا ثابت کرنا چاہتا ہوں، لیکن "برق و باراں" کے مطالعے کے بعد آپ انھیں رسمی شاعروں کی صف سے نکال لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

بعض نظموں میں اشکؔ نے اصولِ قافیہ کی پوری پوری پابندی نہیں کی۔ اگرچہ بادی النظر میں پڑھنے والے کو ان کی اس "قانون شکنی" کا چنداں احساس نہیں ہوتا لیکن سفید کپڑے پر ایسا ہی گا ذرا سا داغ بھی بدنما معلوم ہوتا ہے۔

عندلیب شادانی

کوشش یہ ہے کہ ایک نیا راستہ بنے
چلتے ہیں ہٹ کے رہگذرِ کارواں سے ہم

کچھ اپنے متعلق

جو لہریں من میں اُٹھتی ہیں گیت اُن کو بناتا جاتا ہوں
سنسار کو "پیتم نگری" کا پیغام سناتا جاتا ہوں

جو فرق ہے نور و ظلمت میں وہ اہلِ بصیرت ہی جانیں
میں آئینہ گر ہوں دونوں کو آئینہ دکھاتا جاتا ہوں

میں راہ نمائے شوق نہیں ہاں نقش کفِ پا سے اپنے
اک راہ بنانی ہے مجھکو اک راہ بناتا جاتا ہوں

معیارِ نظر اتنا ہے بلند آنکھوں میں کوئی جچتی ہی نہیں
تصویر بناتا جاتا ہوں تصویر مٹاتا جاتا ہوں

محفوظ رہے یا مٹ جائے کچھ اس سے نہیں ہے مجھکو غرض
میں عمر کے سرکش دھارے پر کچھ نقش بناتا جاتا ہوں

سنہ ۱۹۴۱ء

شاعر کی تمنائیں

اگر اے شمع دل جلنا ہی تھا تجھکو تو جلنا تھا
کسی بیکس کی تُربت پر چراغِ نیم جاں ہو کر

یہ حسرت تھی کہ موجوں کے تلاطم میں بہا جاتا
میں اپنی کشتیِ بے بادباں کا پاسباں ہو کر

بتاتا حالتِ رفتارِ شب صحرانشینوں کو
نجومِ چرخ بن کر کاروانِ درکارواں ہو کر

تھکے ماندے مسافر کو سُلا دیتا لبِ دریا
ہوائے سردبن کر موجۂ عنبر فشاں ہو کر

گذر جاتا فغاں کرتا ہوا سنسان وادی سے
فضاؤں کو جگا دیتا درائے کارواں ہو کر

امید و بیم کے جھگڑے مٹا دینا زمانے سے
"خودی کا دیوتا" بن کر "خدا کا ترجماں" ہو کر
فریبِ حُسن دینا دیدۂ کورِ تمنّا کو
نگاہِ دل نشیں بن کر، ادائے دلستاں ہو کر
کسی کی آرزو کرنی ہی تھی تو عمر بھر کرنا
جوانی میں ہوس بن کر بڑھاپے میں جواں ہو کر
ترقی منحصر عصیاں پہ ہے مقصودِ فطرت کی
تڑپنا سینہ ہائے شوق میں رازِ زیاں ہو کر
یہ حسرت تھی کہ عالمگیر ہوتی روشنی دل کی
یہ حسرت تھی کہ چھا جاتا زمیں پر آسماں ہو کر
مگر کیا کیجئے جب فیصلہ یہ ہے مشیت کا
کہ میں فطرت کی آنکھوں سے گروں اشکِ رواں ہو کر

۱۹۳۵ء

افسانۂ مجبوری

سیلاب محبت بننا تھا طوفانِ تمنا ہونا تھا

تجھکو اس بہتے دریا میں اک تیز سا دھارا ہونا تھا

یا بزم طرب میں جلنا تھا اک شمع تجلی زا بنکر

یا سازِ دلِ فطرت کا تجھے اک شیریں نغمہ ہونا تھا

خود اپنی تمناؤں کا خدا فطرت کا کھلونا بن کے رہے

تجھکو فطرت کے ہاتھوں میں اسطرح نہ رُسوا ہونا تھا

جب جانتے تھے سجدہ کرنا ہے اپنی جبیں کی رُسوائی

کچھ سوچ لیے تم کو دنیا میں پھر عشق کا بندہ ہونا تھا

منہ بند کنواری کلیوں کو گلچیں نے ناحق توڑ لیا

دنیا میں اُن کو کھِلنا تھا اور سوکھ کے کانٹا ہونا تھا

آہوں کی اس آبادی میں ہر قطرۂ ابرِ نیساں کو
دہقاں کا پسینہ بننا تھا یا اشکِ یتامیٰ ہونا تھا
مُردوں کی اس آبادی میں ہر بجھنے والے ذرّے کو
پیشانیِ چرخِ نیلی پر اک نور کا قشقہ ہونا تھا
یہ اشکوں سے لبریز آنکھیں "افسانہ ہیں مجبوری" کا
اے اشک تمہاری آنکھوں کو اس طرح نہ رُسوا ہونا تھا

۱۹۳۶ء

عجیب زندگی

فروغِ چشمِ بصیرت ہیں تجربات مرے
کچھ اس طرح سے گذاری ہے زندگی میں نے

شکست میں بھی نکالے ہیں فتح کے پہلو
سراب سے بھی بجھالی ہے تشنگی میں نے

بدل دیئے ہیں تغافل سے حادثوں کے مزاج
بنا دیا ہے حقیقت کو شاعری میں نے

وہاں حسینوں کا جھرمٹ ہوا بہار آئی
جہاں بجائی محبت کی بانسری میں نے

لیا ہے حُسن کی آنکھوں سے بھی نظر کا خراج
کیا ہے عشق بعنواں دلبری میں نے

نیاز عشق میں برتے ہیں شیوہ ہائے خودی
غرور حسن کو دیکھا ہے ملتجی میں نے

بہا بہا دیئے کاجل حسین آنکھوں کے
رلا رلا کے کسی کو کبھی کبھی میں نے

ہوس کی تیز ہوا میں جلا کے دل کا چراغ
دیار حسن میں کر دی ہے روشنی میں نے

نگاہ ناز سے چھینی ہے تاب گویائی
لب خموش سے کی ہے سخنوری میں نے

کنشت و دیر میں اکثر بتوں کی چوکھٹ پر
کئے ہیں زندہ روایات بندگی میں نے

مگر قیود غلامی سے دل رہا آزاد
نہ اپنے سجدوں کو رسوا کیا کبھی میں نے

زمانہ ہے کہ چڑھائے تیوریاں مجھ سے
بس اس خطا پہ کہ کیوں اپنی قدر کی میں نے

معاشرت مری آزادیوں سے ہے برہم
کہ پائے شوق کی زنجیر توڑ دی میں نے

فضائیں تنگ ہیں مجھ سے کہ بیقرار ہوں میں
ہوائیں چیں بہ جبیں ہیں کہ سانس لی میں نے

خداؤں کو ہے شکایت کہ بے نیاز ہوں میں
بتوں کی ہے یہ روایت وفا نہ کی میں نے

غرض جہاں میں نہیں کوئی مطمئن مجھ سے
عجب طرح سے گذاری ہے زندگی میں نے

سنہ ۱۹۳۷ء

کب تک

رہے گا تند خو سورج جہاں پر حکمراں کب تک
رہیں گے خاک کے ذرے فضا میں پرفشاں کب تک
یہ کمزوروں کی آبادی میں طاقت کی عملداری
رہے گا دیوِ استبداد کا سکہ رواں کب تک
تماشہ کب تلک دیکھے گی قدرت خونِ ارماں کا
گریں گی خرمنِ دہقاں پہ آخر بجلیاں کب تک
رہے گی حسن کی کب تک دلوں پر مشق گلکاری
محبت کی رہیں گی داستانیں خونچکاں کب تک

رہے گی شوق کے پاؤں میں کبتک وقت کی بیڑی

بساطِ یاس پر لیں گی امیدیں سسکیاں کب تک

اگر سوزِ یقیں دل میں ہے آنکھیں دیکھ ہی لیں گی

چھپا رکھیگا منزل کو غبارِ کارواں کب تک

۱۹۳۶ء

غدّار

ہر دیار و ملک میں ہر قوم میں بنتا ہے یہ

گربۂ مسکین بن کر شہر میں پھرتا ہے یہ

مکر اس کی ڈھال ہے اور سادگی تلوار ہے

قوم کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہتا ہے یہ

مسکن مکروریا ہندوستاں ہے فروغ اسکی تجارتکو یہاں

ہوشیار اے مرد غافل ہوشیار

تو اسے پائے گا مندر میں بھجن گاتے ہوئے

منبر مسجد پہ اکثر وعظ فرماتے ہوئے

اور سیاست کے اکھاڑوں میں بصد جوش و خروش

"حریت" کی آگ تقریروں سے بھڑکاتے ہوئے

اصل میں یہ قوم کا غدّار ہے　　اپنے مقصد میں مگر ہشیار ہے

ہوشیار اے مرد غافل ہوشیار

گو بظاہر شہد میں ڈوبی ہیں اس کی بولیاں

در حقیقت زہر سے بڑھ کر ہیں ان کی تلخیاں

جھوٹے وعدوں سے لبھا کر سادہ دل انسان کو

یہ سکھاتا ہے وطن اور قوم سے غدّاریاں

کوئی منتر اس کے کاٹے کا نہیں　　سانپ اس سے بڑھ کے زہریلا نہیں

ہوشیار اے مرد غافل ہوشیار

اپنی ماں بہنوں کی عصمت اور حرمت کچھ نہیں

پاس خودداری و احساسِ شرافت کچھ نہیں

وقت کا فرزند ہے یہ اور دولت کا غلام

اس کے دل میں احترامِ قوم و ملت کچھ نہیں

اس کو نام شان و شوکت چاہیئے لقمۂ تر، جاہ و ثروت چاہیئے

ہوشیار اے مردِ غافل ہوشیار

ہاں وہی بغداد جو تھا ایک شہر زرنگار

جس کے میناروں سے تہذیبِ حجازی آشکار

اس کو جولانگاہ سیلابِ ہلاکو کر دیا

کر دیا ظالم نے اس کو بربریت کا شکار

صفحۂ تاریخ اس سے خونچکاں اس کی سفاکی ہے مشہور جہاں

ہوشیار اے مردِ غافل ہوشیار

دیکھ مغرب سے اٹھیں وہ انقلابی آندھیاں

لے رہی ہیں جنگ کی خونی گھٹا انگڑائیاں

ہچکیاں لیتا ہے رک رک کر تمدن کا چراغ

ناچتی پھرتی ہیں ہر سو موت کی پرچھائیاں

وقت کی موزونیت میں کیا کلام۔ اب یہ ہوگا سر پہ تیغ بے نیام
ہوشیار اے مرد غافل ہوشیار

۱۹۳۸ء

تلخ حقیقت

حقیقت تلخ ہے اور تلخ تر ہیں اس کی تدبیریں
"ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
اگر اس بحرِ طوفانی میں ہونا ہی مقدر تھا
تو اپنی کشتیِٔ جذبات کا خود ناخدا ہوتا
کبھی موجوں سے ٹکراتا کبھی لہروں پہ لہراتا
ہلاکت خیز گردابوں کا سینہ روندتا ہوتا
نسیمِ صبح بن کر شوخیاں کرتا گلستاں میں
گلوں کو گدگداتا کونپلوں کو چھیڑتا ہوتا
گھروں میں یاس کے کرتا امیدوں کے کنول روشن
کسی بیمارِ غم کا مونسِ شامِ بلا ہوتا

اک ایسی بانسری ہوتا کہ جس کے کیف نغمہ سے

جھپکتی آنکھ تاروں کی زمانہ جھومتا ہوتا

قلوبِ سخت کی سنگین دیواروں سے ٹکراتا

سکوتِ شب میں اک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوتا

ڈبو کر کشتیٔ سرمایہ داری قعر دریا میں

میں مغروروں کی حسرت کا تماشہ دیکھتا ہوتا

غریبوں کے محلوں میں چراغِ رہ گذر بن کر

اندھیرے جھونپڑوں کو بھیک اپنی دے رہا ہوتا

چراغ رہگذار بے کسی جس کے اُجالے میں

کسی مزدور فاقہ کش کا بچہ کھیلتا ہوتا

بہشت قیصر و فغفور کے سنسان کھنڈروں میں

تباہی اور بغاوت کا ترانہ گا رہا ہوتا

پتنگوں کو حرارت شمع کو سوزش عطا کرتا
اگر جلنا ہی تھا دل کو تو اک آتشکدہ ہوتا
مگر افسوس فطرت نے مجھے شاعر بنا ڈالا
نہیں تو اشک اپنی آرزوؤں کا خدا ہوتا

سنہ ۱۹۴۰ء

فریاد

مظلوم کی آہوں سے فضائیں ہوئی آباد

ہے تنگ غریبوں کے لئے عالم ایجاد

فریاد ہے فریاد فریاد ہے فریاد

بے تیغ و سناں قتل کئے جاتے ہیں انساں

قانون ہی موجودہ تمدن کا ہے جلاد

فریاد ہے فریاد فریاد ہے فریاد

رحمت کی گھٹا کھل کے برستی ہے ان ہی پر

بھولے سے بھی آئے نہ کبھی جن کو خدا یاد

فریاد ہے فریاد فریاد ہے فریاد

۱۹۳۶ء

دہقان

(۱)

تپتے سورج کی گرمی سے جب نخل چمن مرجھاتے ہیں
جب قسمت کے پیارے بیٹے پنکھوں کی ہوائیں کھاتے ہیں
جب تیز نگاہیں پڑتی ہیں دنیا پر ہر تاباں کی
اس وقت کوئی دیکھے حالت قسمت کے ستائے دہقاں کی

ماتھے سے پسینہ بہتا ہے اور بہکر پاؤں تک آتا ہے
وہ اپنی دھن میں گاتا ہے اور ہل کو چلائے جاتا ہے
تقدیر پہ اپنی شاکر ہے تکلیف کا کچھ احساس نہیں
دل اس کا امید کا گھر ہے۔ امید کے گھر میں یاس نہیں

جب اس کی جبین محنت پر افکار کے بل پڑجاتے ہیں
فطرت کا کلیجہ کھولتا ہے اور بادل گھر کر آتے ہیں
جب جھوم کے بدلی اٹھتی ہے جب زور سے پانی ہوتا ہے
اس وقت یہ کشت محنت میں تقدیر کا دانہ بوتا ہے
بجلی کوندے، بادل گرجے، یہ مرد عمل کب ڈرتا ہے
جب فطرت برہم ہوتی ہے، فطرت سے جنگ بھی کرتا ہے

(۲)

اے قطرۂ ابر نیسانی انجام تیرا اچھا ہوتا
پریشانیٔ دہقان سے تو اگر موتی بن کر ٹپکا ہوتا
اے گوہر تاج سلطانی تجھ سے یہ سوال فطرت ہے
ٹپکیں جو جبین محنت سے ان قطروں کی کیا قیمت ہے

سن اے دہقان شاعر تجھکو کہتا ہے فرشتہ دولت کا
سب تجھ سے روزی پاتے ہیں تو سایہ ہے دستِ قدرت کا

تجھ سے ہے رگوں مین خونِ عمل چہروں کی ہے زیبائی تجھ سے
تعمیر کے ہنگامے تجھ سے، تہذیب کی رعنائی تجھ سے

لعنت اس دنیا پر جس میں آسودہ نہ ہو محنت تیری
اے کاش اس دورِ تمدن نے سمجھی ہوتی قیمت تیری

اے کاش زمانے میں چلتی اک ایسی تند و تیز آندھی
پرہول و جنوں انگیز آندھی، خوں ریز و تلاطم خیز آندھی

دستاریں سروں سے گر گر کر تودوں مین خاک کے مل جائیں
قصرِ سرمایہ داری کی سنگین بنیادیں ہل جائیں

غارت ہو جاتی یہ بستی خونخواروں کی حیوانوں کی
عالم ہوتا مزدوروں کا دنیا ہوتی دہقانوں کی

سنہ ۱۹۳۶

زندگی کی پکار

وہاں میں سانس لیتی ہوں وہاں میں سانس لیتی ہوں
جہاں شاعر کے شور انگیز نغموں کا بسیرا ہو
جہاں خوابوں کی آبادی میں مستقبل کا ڈیرا ہو
جہاں زہرہ کے بربط پر فضائیں رقص کرتی ہوں
ہوائیں رقص کرتی ہوں گھٹائیں رقص کرتی ہوں
جہاں موجوں کی شوخی ریگ کو بہنا سکھاتی ہو
جہاں فطرت سرورِ بادۂ مستی لٹاتی ہوں
جہاں روحیں شفق کی شام میں تحلیل ہوتی ہوں
جہاں تابانیاں وجدان میں تبدیل ہوتی ہوں
وہاں میں سانس لیتی ہوں وہاں میں سانس لیتی ہوں

جہاں دیر و حرم دونوں ہوں روشن شمع ایماں سے

جہاں آزاد ہوں سجدے نزاع کفر و ایماں سے

جہاں ظل حکومت ابر رحمت بن کے گھرتا ہو

جہاں مجرم کے سر پر تربیت کا ہاتھ پھرتا ہو

جہاں ذرات کے پہلو میں بھی اک مضطرب دل ہو

اک ایسا دل جو درد نوع انسانی کا حامل ہو

جہاں انساں کی معراج فضیلت ختم ہوتی ہو

ریاضت ختم ہوتی ہو عبادت ختم ہوتی ہو

وہاں میں سانس لیتی ہوں وہاں میں سانس لیتی ہوں

جہاں غربت کی بدلی میں جوانی مسکراتی ہو

جہاں مجبوریوں میں بھی محبت گنگناتی ہو

جہاں اشکوں کی بارش ہو جہاں آہوں کا طوفاں ہو

جہاں ظلمت کدوں میں دل بجائے شمع سوزاں ہو
جہاں ہو راستہ آندھی کا مزدوروں کی بستی سے
جہاں شامت بلندی کی جنم لیتی ہو پستی سے
جہاں ہوں روٹیاں مہنگی مگر انسان سستے ہوں
جہاں مزدور کے بچے کھلونوں کو ترستے ہوں
جہاں تہذیب کی رعنائیاں آنکھوں سے اوجھل ہوں
جہاں معصوم پلکیں گردِ مزدوری سے بوجھل ہوں
جہاں عورت چھپائے لاج اپنی چیتھڑے سی کر
جہاں شاعر کی فطرت آگ اُٹھو کے خونِ دل پی کر
جہاں سُلگی ہوئی روحیں دھواں دیتی ہوں سینے سے
جہاں بارود کی بو آئے دہقاں کے پسینے سے

جہاں خونی علم لہرا رہا ہو انقلاب اپنا

چھپائے ہو جہاں دل میں بغاوت پیچ و تاب اپنا

جہاں ہوں سازشیں بے تاب آگ اپنی اگلنے کو

جہاں بے کل ہوں تلواریں نیاموں سے نکلنے کو

وہاں میں سانس لیتی ہوں وہاں میں سانس لیتی ہوں

۱۹۴۵ء

ہلال عید

فضاؤں کے سمندر میں تلاطم ہو گیا برپا

مہ نو کی سنہری ناؤ اچھلی کھا کے ہچکولا !

نظر نیچی کئے محمل سے باہر آ گئی لیلےٰ

تبسم آتے آتے رک گیا شرما گئی لیلےٰ

کن انکھیوں کا اشارہ شوخیاں کرتا ہے گھونگھٹ میں

شرارت کے عناصر مل گئے ہیں مسکراہٹ میں

ہلال عید کو کیوں خنجر ناز و ادا کہئے

برا کیا ہے جو محراب جبیں دلربا کہئے

مبارک ہو سمیٹی لیلیٔ شب نے ردا اپنی

عروس عید نے پردے سے دکھلائی ادا اپنی

مساجد میں موذن کی صدائیں بھلی جاتی ہیں

لب زاہد کو جنبش ہے دعائیں بہکی جاتی ہیں

تمناؤں کی کلیاں کھل رہی ہیں دل کے دامن میں

ترانہ ہے مسرت کا فضا کے دل کی دھڑکن میں

بہار عید آئی حسن کی رونق بڑھانے کو

جواں بیوہ کے دل میں شمع حسرت کی جلانے کو

بہار عید حسرت کی خلش دل میں جگاتی ہے

یتیموں کی نظر کو سسکیاں لینا سکھاتی ہے

بہار عید کیا ہیجان جذبات تمنائی

بہار عید کیا دولت کی اک بے کیف انگڑائی

دھواں اٹھے نہ کیوں شاعر کے قلب نیم سوزاں سے

کہ کھیلی جا رہی ہیں ہولیاں خون غریباں سے

وہ دیکھو ہو رہی ہے روشنی ایوان دولت میں
لہو دہقان کا جلتا ہے چراغ بزم عشرت میں
ہلال عید خونِ آرزو رنگینیاں تیری
یتیموں کی نگاہ بے زباں افسانہ خواں تیری
قسم ہے اے ہلال عید اشکوں کی روانی کی
قسم ہے اے ہلال عید بیوہ کی جوانی کی
قسم ان کاروانوں کی جو لٹ جائیں سر منزل
قسم ان کشتیوں کی ڈوب جائیں جو لب ساحل
قسم ان سرخ آنکھوں کی ہو طاری جن پہ بیہوشی
قسم اس نطق کی جو ہو گیا ہو نذر خاموشی
قسم ان زرد ہونٹوں کی بنی جن کے لئے نرمی
قسم ان سرد بوسوں کی نہیں جن میں ذرا گرمی

قسم اس نالۂ شب کی نہیں جس کا کہیں مامن
قسم اس چشمِ تر کی جس کی قسمت میں نہیں دامن
قسم ہے اس جماہی کی جو ہو رسوا کنِ مستی
قسم اس جوانی کی جو ہو وقفِ غمِ ہستی
قسم ہے اے ہلالِ عید سائل کی نگاہوں کی
قسم ہے کج کلاہی کی قسم ہے کج کلاہوں کی
کہ رونق تجھ سے ہو سکتی ہے عشرت کے دیاروں میں
مگر کیا خاک ہو گی روشنی دل کے مزاروں میں

۱۹۳۸ء

عید اور فطرت کا گہرا طنز

توپوں کی گرج، گولوں کی دھمک، [1] پرہول صدا طیاروں کی
بھوکی نظریں محتاجوں کی، اکھڑی سانسیں بیماروں کی
ہر چوکھٹ پر "ٹھنڈے آنسو" دکھیاؤں کے بیواؤں کے
ہر کوچے میں عریاں لاشیں مسکینوں کی ناداروں کی
مفلس ماؤں کی چھاتی میں سوکھے ہوئے دھارے جیون کے
بھوکے بچوں کے شیون سے معمور فضا بازاروں کی
سوکھے ڈھانچوں کی گردن میں خونی پنجہ دھنوانوں کا
گورے مکھڑے پہ بھکارن کے چبھتی نظریں زرداروں کی
منعم کے طمانچوں کے یہ نشاں بوڑھے سائل کے گالوں پر
اک گہرا طنز ہے فطرت کا ہم عید منانے والوں پر

[1] کلکتہ پر جاپانی بمباری

گلہائے چمن مرجھائے ہیں افسردہ ہے ذوقِ گلچینی
یہ رنگ نہیں ہے چہروں پر کرتی ہے تمسخر رنگینی
عارض کی شکن بن جاتی ہے ہونٹوں پر تبسم آ آ کر
سائل کی صدا بن جاتی ہے مطرب کے گلے کی شیرینی
"دان اور دیا" کے پردے میں اوچھے منصوبے دولت کے
"فرض اور عمل" کی گھونگھٹ میں قانون کا جور آئینی
اس دیو سیاست نے آخر تہذیب کا سب کچھ چھین لیا
اخلاق سے سوز ہمدردی، احساس سے بیتابی چھینی
میکش سے سرور میخواری، مفلس سے غرور ناداری
شاعر سے شعور درد جگر اور حسن سے ناز خود بینی
جز حسرتِ فردا کچھ بھی نہیں امید کی خالی جھولی میں
کیا عید منائے گا کوئی اس خون اور آگ کی ہولی میں

قحط ۔ سنہ ۱۹۴۳ء

اندھیری رات کا مسافر

ترے ہمسفر سو گئے ہیں مسافر
اندھیرے ہیں سب کھو گئے ہیں مسافر

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

یہ تاریک صحرا یہ پرپیچ راہیں
تری منتظر ہیں ہزاروں بلائیں

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

جہنم کا منظر تری رہگذر ہے
بھیانک ہے، پرہول ہے، پرخطر ہے

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

کہیں ابھرے ابھرے کہیں کچھ مٹے سے
ہیں افسانہ خوانِ نقشِ پا رفتگان کے

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

نہ اب تک کوئی اس سفر سے پھرا ہے
نہ منزل کا رستہ کسی کو ملا ہے

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

کہ تخیل منظر سراب نظر ہے
یہ تخلیق بے چارگیٔ بشر ہے

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

یہ وہ شب ہے جس کی سحر ہی نہیں ہے
جو ہے بھی تو تابِ نظر ہی نہیں ہے

مسافر مسافر کہاں جا رہا ہے

سنہ ۱۹۴۳ء

شاعر اور فلسفی

فلسفی شاعر سے :-

ظلمت خط و خال میں گم ہیں ترے تخیلات
میری نگاہ شوق ہے شرح جمال کائنات

میرا خیال برق رو اور فلک کی رفعتیں
تیری جمال بال و پر اور حد تعینات

میری حدیث شوق کیا ایک بہار جاوداں
تیری فغان عشق کیا چند فسردہ واقعات

تیرے خیال پست سے پست دلوں کے حوصلے
میرے کشود و بست سے جنبش نبض کائنات

میری تپش تپش نہیں بلکہ ہے سوز زندگی

تیری خلش خلش نہیں بلکہ ہیں کچھ مطالبات

میری خودی خودی نہیں بلکہ ہے حکمراں شوق

تیری خودی خودی نہیں بلکہ خدائے خواہشات

طائر فکر ما گذشت از حد چرخ چنبری

تو کہ اسیر دام عشق کے بہ ہوائے ما پری

شاعر فلسفی سے :-

میرا ہر ایک شعر ہے تازہ پیام زندگی

تیری ہر ایک فکر ہے باعث رنج کائنات

میرا ہر ایک داغ دل باغ و بہار آرزو

دفتر عقل میں ترے خون وفا کے واقعات

فکر فلک رسا مری دفتر جبرئیل جذب

تیرا دماغ پست اور بندگی توہمات

میری حدیث آرزو کیف و سرور سرمدی

تیری حدیث آرزو چند شریر خواہشات

میرے خیال میں جہاں ایک نتیجۂ عظیم

تیرے خیال میں جہاں کچھ نہیں چند حادثات

میرا ہر ایک جذب دل نگہت گل کا ہے نچوڑ

خشک تیرے تخیلات، سست تری توہمات

دست خیال ما گرفت دامن لیلئ امید

پنجۂ اختیار تو جامۂ شوق خود درید

۱۹۳۶ء

رقص

جیسے شاعر کا تصور جیسے عارف کا جلال
جیسے تخلیق جہاں کا ذہن یزداں میں خیال
جیسے مستی میں شرابی جیسے لرزش میں شراب
زینۂ مشرق پہ جیسے لڑکھڑائے آفتاب
کالی کالی بدلیوں میں جیسے کوندے کی لپک
نرم جھونکوں سے ہوا کے جیسے کھیتوں میں لچک
نیند کے عالم میں جیسے دور بجتا ہو ستار
دھوپ اور بدلی میں جیسے ہلکی ہلکی سی پھوار
بین کے نغمے پہ ہو جسطرح ناگن جوش میں
حسن کی انگڑائی جیسے عشق کے آغوش میں

جیسے اک منظوم بے ربطی نوائے عشق میں
جیسے دھڑکن دو دلوں کی ابتدائے عشق میں

جیسے ہیجاں تمنا نبض محسوسات میں
ندیاں چڑھتی ہوئی جیسے بھری برسات میں

منفعل ہیں الغرض فکر رسا کے حوصلے
اشک تیرے رقص کو کسی چیز سے تشبیہ دے

کل رات کو

کالی کالی بدلیاں مستی بھری برسات کی
لے رہی تھیں چرخ پر انگڑائیاں کل رات کو
پڑ رہی تھیں ننھی ننھی نشہ آور بوندیاں
رقص کرتی تھیں فضا میں مستیاں کل رات کو
عقل تھک کر سو گئی تھی تلخی افکار سے
دل پہ بھی طاری تھیں کچھ دیوانگیاں کل رات کو
ناامیدی تھی بساط شوق پر پھیلی ہوئی
آرزوئیں ہوتی جاتی تھیں جواں کل رات کو
ٹوٹتی جاتی تھیں دیوار عناصر کی حدیں
تھے مشیت پر ارادے حکمراں کل رات کو

دل جواں، جذبے جواں، آنکھیں جواں، فطرت جواں
ساری دنیا تھی نگاہوں میں جواں کل رات کو

تھی حجاب نازنیں ترکیب آغوش نیاز
دیدنی تھیں حسن کی انگڑائیاں کل رات کو

عشق کے ہونٹوں پہ اک ہلکی سی جنبش کے لئے
منتظر تھیں حسن کی رعنائیاں کل رات کو

دو دھڑکتے دل کہانی کہہ رہے تھے شوق کی
خامشی تھی داستاں در داستاں کل رات کو

پھیلتا جاتا تھا کاجل عارض گل رنگ پر
مدھ بھری آنکھوں سے تھی آنسو رواں کل رات کو

اشک جو کچھ تھا تصور تھا حقیقت کچھ نہ تھی
تھا حقیقت پر تصور حکمراں کل رات کو

(۱)

جھکی جھکی چشمِ شرمگیں لئے ہوئے حشر زندگی کا
کنارِ آبِ رواں گنگا کھڑی ہے اک نوجواں جوگن

نچوڑی زلفوں کے چند قطرے جبیں پہ یوں جھلملا رہے ہیں
کہ جیسے مندر کے بام و در پر ہوں ننھے ننھے چراغ روشن

ہے چال الڑھ مگر لجیلی، لٹیں ہیں شانوں پہ گیلی گیلی
رندھی رندھی انکھڑیاں نشیلی شباب کے ولولوں کا مدفن

سلونے رخ پر بھبھوت جیسے چمن میں ہو شام کا دھندلکا
سفید آنچل میں زلف سرکش ہو جیسے پانی میں کالی ناگن

(۲)

کھڑی ہوئی ہے نہا کے جوگن اُفق سے سورج ابھر رہا ہے

ادھر ہے کچھ صبح کا دھندلکا، اُدھر شفق لہلا رہی ہے

ادب سے گردن جھکی ہوئی ہے خدائے مشرق کی بارگہ میں

خدائے مشرق کے پاک ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی آ رہی ہے

مجھے یہ ڈر ہے نظام عالم کہیں نہ ہو جائے اشک برہم،
کنوارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ سے کل فضا تھرتھرا رہی ہے

(۳)

اری اچھوتی یہ پاپ نگری اچھوتیوں کے لئے نہیں ہے

تو اپنی رعنائیوں کو لیکر اک ایسے سنسار میں چلی جا

جہاں نہ ہو رسم گل فروشی، جہاں نہ ہو دست شوق گلچیں

جہاں کسی کا حسین مکھڑا، نہ ہو ہجوم نظر سے میلا

جہاں نہ ہوں حسن کی دکانیں، جہاں نہ ہو روپ کی تجارت

جہاں گناہوں کی ہو نہ منڈی جہاں محبت کا ہو نہ سودا

جہاں نہ معصومیت کے خوں سے گناہ کے آنچل ہوں رنگیں

جہاں نہ انسانیت کے سینے سے اٹھے حیوانیت کا شعلہ

اک ایسی دنیا تلاش کر لے جہاں محبت میں ہو نہ لالچ

اک ایسی دنیا تلاش کر لے جہاں صداقت پہ ہو نہ پہرا

سنہ ۱۹۴۱ء

پھول کا تحفہ

تمہارے رس بھرے معصوم لب کے چومے ہوئے
وفا کے نرم تنفس کی رو میں جھومے ہوئے
فروغ صبح بہاراں شمیم گستر پھول
نگاہ ناز محبت کے ترجماں بن کے
جو کہہ سکیں نہ کبھی تم وہ کہہ گئے مجھ سے
تمہارے بھیجے ہوئے عشق کے پیمبر پھول

مطالعات

(۱)

پیکر انتظار دیکھا ہے
رُخ پہ غم کا غبار دیکھا ہے
عشق کا یہ کمال ہے ہمدم
حسن کو سوگوار دیکھا ہے

(۲)

پیکر دلنشیں بنی ہو تم
دلربا نازنیں بنی ہو تم
اشک آنکھوں میں کاکلیں برہم
آج کتنی حسیں بنی ہو تم

مثلِ غبارِ راہ چل وقت کے قافلے کیساتھ
تیرے لئے رکے گی کیوں گردشِ چرخِ چنبری

سروش

صورت زلف بتاں قسمت دنیا ہے سیاہ
روشنی کوئی بعنوان سحر پیدا کر

اپنی آنکھوں کو نہ دے اپنے تصور کا فریب
میری دنیا کے لئے میری نظر پیدا کر

پر پرواز ہے کیا شدت عزم پرواز
گرمیٔ شوق سے سامان سفر پیدا کر

تو وہ مالی ہے پسینہ ہے ترا ابر کرم
خشک صحرا میں گیاہ و گل تر پیدا کر

اشک زلف و رخ جاناں کی حکایت کب تک
اک نیا سلسلۂ شام و سحر پیدا کر

۱۹۳۹ء

نالۂ جرس

اے کہ تیرے بیان سے وجد میں روح آرزو
اے کہ تیرے کلام سے رقص میں حور شاعری

جذبۂ موج ہے بلند اور مزاج بحر تند
پست نہ ہو کہیں ترا حوصلۂ شناوری

لے کے نشان حریت تیز چل اور تیز چل
باغ و بہار حسن پر ڈال نگاہ سرسری

سنت رفتگان کو چھوڑ جادۂ نو تلاش کر
شوق ہے خضر راہ خود شوق کی کر نہ رہبری

دل ہے ترا یہ کیا کہا کشتۂ ناز مہوشاں
کشتۂ ناز مہوشاں ! ننگ ہے تجھ سے شاعری

خونِ وطن لگن لگن، جورِ خزاں چمن چمن
اور تیری گرمیٔ سخن وقفِ حدیثِ دلبری
دودِ چراغِ عقل سے ایک نئی سحر بنا
قسمتِ دہر ہے سیاہ صورتِ زلفِ کافری
فاقہ کشوں کو دے نجات پنجۂ روزگار سے
ضربِ نظر سے چور کر قصرِ بلندِ قیصری
مثلِ غبارِ راہ چل وقت کے قافلے کے ساتھ
تیرے لئے رُکے گی کیوں گردشِ چرخِ چنبری

قائد کی موت پر

اے غرور و نازِ ملت تیری منزل ہے وہاں
موت جس منزل پہ بنتی ہے حیاتِ جاوداں
تیری ہمت صف شکن تیری نظر یزداں شکار
تیرے آب و گل میں مضمر سیرتِ پیغمبراں
سرنگوں قدموں پہ تیرے عظمت و شانِ فرنگ
اے متاعِ بے بہائے دولتِ اسلامیاں
تیرے آگے لرزہ براندام دیو و برہمن
تیری حق گوئی سے باطل کفر کی تاریکیاں
تو وہ مینارِ تجلی تھا شبِ تاریک میں
تجھ سے پاتی تھی بھٹکتی ناؤ ساحل کا نشاں

مشرق و مغرب میں چرچے ہیں نئے عنوان سے

تو نے اس انداز سے چھیڑی پرانی داستاں

راہ وہ بتلائی تو نے منزلِ مقصود کی

جس پہ بے باکانہ بڑھتا جا رہا ہے کارواں

غازیانِ صف شکن کی برق رفتاری تو دیکھ

تھم گیا ہے وقت کا اُمنڈا ہوا سیلِ رواں

بڑھ رہے ہیں صف بہ صف پھر حیدری انداز سے

ان کی ہمت ہے جواں ان کے ارادے ہیں جواں

یاد ہے وہ آندھیوں کا شور گردابوں کا زور

وہ قیامت کا تلاطم وہ بلائے ناگہاں

کشتیٔ ملت تھی گردابوں پہ یولائی ہوئی

جھکڑوں میں اڑ چکی تھیں بادباں کی دھجیاں

پے بہ پے امواج کی ہر سمت سے تھیں یورشیں

ناچتی پھرتی تھیں ہر سو موت کی پرچھائیاں

وہ گھٹاؤں کا تصادم اور وہ کوندوں کی لپک

کفر کے سینے سے وہ اُمنڈی ہوئی تاریکیاں

الغرض ملت کی کشتی کو ڈبونے کے لئے

اہرمن برسا رہا تھا ہر طرف بربادیاں

یاد ہے ہاں اب بھی وہ خونیں ڈرامہ یاد ہے

جب کہ تھا سب کی زباں پر الحفیظ والاماں

اس بلا کی کشمکش میں ناخدائی تو نے کی

اے شکستہ کشتیٔ ملت کے تنہا پاسباں

دب گیا نعروں سے تیرے ہونکتی آندھی کا شور

تھم گیا ہمت سے تیری کفر کا سیل رواں

تیری ہمت کے تصدق تیری جودت کے نثار

اے حسین ابن علی کے وارثہ دار نامدار

مہاجر کی ایک رات

دن کے ہنگاموں سے تھک کر سو گئے فکر و دماغ
آسماں پر ٹمٹماتے ہیں ستاروں کے چراغ
شہر پر چھایا ہوا اندوہ کا بوجھل غبار
راستوں میں دو رنگ دھندلے چراغوں کی قطار
بدلیوں میں یوں نظر آتا ہے پیلا ماہتاب
جیسے اک بیمار دوشیزہ کا افسردہ شباب
نصف شب کی ملگجی سی چاندنی پھیکی اُداس
سرد جھونکوں میں ہوا کے جوہی اور چمپے کی باس
روح فرسا منظروں میں رہگذر ڈوبے ہوئے
ایک لامحدود غم میں بام و در ڈوبے ہوئے

زندگی کی ہر روش پر خاموشی چھائی ہوئی
خامشی میں روح محسوسات گھبرائی ہوئی

میکدے خاموش ہیں اور رقص گاہیں بند ہیں
غم غلط کرنے کی کل رنگین راہیں بند ہیں

نیند کو ترسی ہوئی آنکھوں میں آنسو لب پہ آہ
ہے یہی ترک وطن کرنے کی پاداشِ گناہ

ہائے وہ رنگیں زمانہ یاد پھر آنے لگا
پھر تصور آئینہ ماضی کا دکھلانے لگا

زخم جو دل میں دبے تھے مسکراتے ہیں پھر آج
ذہن میں لاکھوں ستارے جگمگاتے ہیں پھر آج

پھر لگی گنگا بھی بہنے دلربا انداز سے
ماہِ نو کھینے لگا اپنا سفینہ ناز سے

آہ اے میرے تصور اے مری بزمِ خیال
تو نے سوچا بھی ہے اس شب زندہ داری کا مآل
ایک آوارہ وطن شاعر کا پیچھا چھوڑ دے
چھوڑ دے میں تیرے قرباں مجھکو تنہا چھوڑ دے
کتنے گل کتنے گلستاں چھوڑ کر آیا ہوں میں
کتنے شیشے، کتنے ساغر توڑ کر آیا ہوں میں!
کتنے بتخانوں کی صبحیں، کتنے نغموں کی برات
کتنے میخانوں کی راتیں، کتنے شیریں التفات
کتنی زلفوں کی گھٹائیں، کتنے ہونٹوں کی شراب
کتنی باہوں کی گدازی، کتنے عارض کے گلاب
کتنے سجدے بیخودی کے، کتنے رنگیں کیفیات
کتنے کعبے، کتنے کاشی، اور کتنے سومنات

میں نے قائد کے اشارے پر یہ سب کچھ چھوڑ کر

اپنے احباب و اعزا سے بھی رشتے توڑ کر

گلستاں کو اپنے خود آتش بداماں کر دیا

اپنے ہی ہاتھوں سے اُس کو نذرِ طوفاں کر دیا

میری قربانی کا لیکن مجھکو یہ بدلا ملا

"اجنبی" "مفلس" "مہاجر" کا مجھے تمغہ ملا

جن گداؤں کو بنایا میں نے فخرِ روزگار

جن سروں کو میں نے پہنایا ہے تاجِ زرنگار

آج میں ان کی ہی نظروں میں ذلیل و خوار ہوں

جس سے خم پشت حکومت ہے وہ سنگیں بار ہوں

اے زعیمانِ وطن اے حاکمانِ ذی وقار

مسندِ برطانیہ کے وارثہ دار نامدار

یاد ہے وہ نور و ظلمت کا تصادم یاد ہے

کفر و باطل کا وہ طوفان و تلاطم یاد ہے؟

عصمتیں لوٹی گئی ہیں شاہ راہِ عام پر

چڑھ گئی ہیں بھینٹ کتنی مریمیں اسلام پر

حُسن تھا پوشیدہ جن کا چشم مہر و ماہ سے

کارواں گذرے ہیں ان کے برہنہ تن راہ سے

کتنی زہراؤں کے سر سے چادریں چھینی گئیں

کتنے معصوموں کے خوں سے ہولیاں کھیلی گئیں

جھونپڑے میں، قصر میں، محل و شبستاں میں لہو

شہر میں جنگل میں صحرا میں بیاباں میں لہو

مسجدوں میں، مقبروں میں، خانقاہوں میں لہو
مذہب و ملت کی سانسوں میں نگاہوں میں لہو
اس طرح اپنے لہو کو میں نے ارزاں کر دیا
غنچۂ امید کو تیرے گلستاں کر دیا
کٹ چکی ہے صبح آزادی کی خون آشام رات
تم بھلا سکتے ہو دل سے اس کے خونیں واقعات
"قلب شاعر سے مگر وہ داغ جا سکتے نہیں
دورِ سال و ماہ و روز اُن کو مٹا سکتے نہیں

اعتراف

شبِ نشاط کے پیاروں کو چھوڑ آیا ہوں
میں کتنے چاند ستاروں کو چھوڑ آیا ہوں
یہ چاندنی یہ گھٹائیں یہ نیلگوں دریا
میں ایسے کتنے نظاروں کو چھوڑ آیا ہوں
تصورات کی دنیا حسین تھی جن سے
میں ان حسین دیاروں کو چھوڑ آیا ہوں
کوئی بتائے مجھے اب جیوں تو کیسے جیوں
میں زندگی کے سہاروں کو چھوڑ آیا ہوں
ہے اپنی پستیٔ ہمت کا اعتراف مجھے
خزاں کی زد پہ بہاروں کو چھوڑ آیا ہوں

ڈھاکہ۔ میگھنا۔ مشرقی پاکستان

غزلیات

ردا کوئی دلربا نہیں ہے نگہ کوئی دلنشیں نہیں ہے
طلسم ذوقِ نظر ہیں جلوے وگرنہ کوئی حسیں نہیں ہے

ہمارے مقصد کی گمرہی سے قدم قدم پر بنے ہیں کعبے
یہاں جھکی ہے وہاں جھکے گی کچھ اعتبارِ جبیں نہیں ہے

ازل سے یہ رند لاابالی گدائے میخانہ نظر ہے
قسم تیری کافر انکھڑیوں کی شراب ایسی کہیں نہیں ہے

ہم اپنا دُکھڑا سنا رہے ہیں وہ بیٹھے سن بھی رہے ہیں لیکن
کچھ اس طرح مسکرا رہے ہیں کہ جیسے اُن کو یقیں نہیں ہے

قسم ہے ان سرخ آنسوؤں کی کہ جن کی لڑیاں کبھی نہ ٹوٹیں
کہ اب ان آنکھوں میں کوئی قطرہ متاعِ اشکِ حزیں نہیں ہے

یہ پیکر گل مجبور رہے قدرت کا یہی جب منشا ہے ۔

پھر دل میں یہ شورش کیسی ہے پھر سر میں یہ سودا کیسا ہے

اللہ رے دل کا اوچھا پن ہر چیز پہ مچلا جاتا ہے

ہر راہ میں سجدے کرتا ہے ہر گام پہ ٹھوکر کھاتا ہے

یہ آبلے پائے ہمت کے صحرا میں چراغاں کر دینگے

ہر گام پہ میر النقش قدم اک شمع جلاتا جاتا ہے

معصوم فضا میں بچپن کی اک کھیل جو ہم نے کھیلا تھا

فطرت کی جمالی دنیا میں اس کھیل کا اب تک چرچا ہے

اس عمر رواں کے دھارے پر آئے شک مسلسل بہنا جا

جو ڈوب گئے سو ڈوب گئے مڑ مڑ کے انھیں کیا تکتا ہے

میں تھا اک شمع سوزاں رات بھر اُٹھا دھواں مجھ سے
سنی دنیا نے سو سو طرح دل کی داستاں مجھ سے

ڈبو دی آبروئے سوز پنہاں تو نے آنکھوں کی
شکایت کر رہے ہیں قطرہ ہائے رائگاں مجھ سے

رفیق کاروان نکہت گل ہے میری وحشت
نہ آگے بڑھ سکے گی تو نگاہ باغباں مجھ سے

مجھے نیند آگئی نغمی راہ کی ٹھنڈی ہواؤں میں
میں اک واماندہ ہوں پوچھو حدیث کارواں مجھ سے

مرے دل کی تمنا طرۂ دستار گل چیں ہو
اور اس پر یہ قیامت داد مانگے باغباں مجھ سے

سراپا ماتم نظارہ ہے آنکھوں کی مایوسی
کہ پردہ اٹھ چکا ہے اور جلوے ہیں نہاں مجھ سے

میں چپ ہوں آشک لیکن باوجود ضبط بیتابی
وہ آنکھیں کر رہی ہیں پرسشِ جرم وفغاں مجھ سے

نگاہ باغباں کیا کہہ گئی گلہائے خنداں سے
کہ اٹھا کارروانِ رنگ و بو صحنِ گلستاں سے

مدد اے دیدۂ بینا مدد اے تابِ نظارہ
تجلی مسکراتی ہے نقابِ روئے جاناں سے

نسیمِ صبح کے جھونکوں سے کیا کھٹکا بھلا اس کو
مری شمعِ تمنا وہ ہے جو لڑتی ہے طوفاں سے

معاذ اللہ صحرا کی شبِ تاریک و طوفانی
مسافر خود نہ جل جائے چراغِ زیرِ داماں سے

لرز اٹھتا ہوں بیداری میں یوں تخئیلِ عشرت پر
کہ جیسے چونک اٹھتا ہو کوئی خوابِ پریشاں سے

جنوں کی تربیت کر اشک یہ ننگِ محبت ہے
کسی کا راز رسوا ہو ترے چاکِ گریباں سے

"آپ تو بزم میں بے پردہ ہوں پروا نہ کریں
اور ہم آنکھوں سے بھی تسکین تمنا نہ کریں
تند جھونکوں میں حوادث کے نہ ٹھیرے گی کبھی
اہل دل شمع محبت کو جلایا نہ کریں
میرے جذبات کی دنیا میں نہ طوفاں ہو بپا
آپ مجھکو نگہ لطف سے دیکھا نہ کریں
دل کمبخت دھڑکنے ہی سے یا باز آجا
یا یہی کہدے کہ ہم عرض تمنا نہ کریں
دل کے گہوارے میں ہیں عشق کے جذبات لطیف
فتنہ پرداز نگاہیں انھیں چھیڑا نہ کریں
نوجوانوں کو ہے یہ اشک حزیں کا پیغام
دل کے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو بجھایا نہ کریں

وہ تھی، زلفیں تھیں اور شانہ تھا
کتنا الجھا ہوا فسانہ تھا

ان کو اٹھنا ہمیں اٹھانا تھا
دردِ سر یوں ہی اک بہانہ تھا

پاؤں میں آبلے نہ پڑ جاتے
دو قدم پر غریب خانہ تھا

کیف عہدِ شباب کیا کہنا
ہر قدم پر شراب خانہ تھا

کھو گئی تھی نگاہ جلووں میں
سارا عالم نگار خانہ تھا

تم نے اس کو بھی سُن لیا ہوتا
اشکؔ کا حال بھی فسانہ تھا

یاس نے مارا آس نے مارا
مجھکو ہوس کے پیاس نے مارا

کشتۂ رنگینی ہو زمانہ
مجھکو تو بوباس نے مارا

دل تو چونک چکا تھا لیکن
مجھکو وفا کے پاس نے مارا

یہ جو نہ ہوتا پھر بھی نہ ہوتا
طاقت کے احساس نے مارا

اشک کی غزلیں سن کے وہ بولے
اشک کو اس بکواس نے مارا

رہروانِ شوق ہیں اور شاہ راہِ عام ہے

اشک کو دیکھو نیا رستہ نیا اقدام ہے

اے جنوں رکنے نہ دینا کارواں کو راہ میں

وقت کے ہر موڑ پر اک منزلِ اوہام ہے

شدتِ ذوقِ پرستش کی ہے ساری آذری

ہر قدم پر راہ میں اک کعبۂ اصنام ہے

یا گھنی زلفیں پریشاں ہو گئی ہیں دوش پر

اشک یادِ یارِ گلشن پر سوادِ شام ہے

متفرقات

ستارہ بن نہ سکا ماہتاب ہو نہ سکا

حریم ناز میں دل باریاب ہو نہ سکا

نگاہ ناز جھکی اور رہ گئی جھک کر

سوال شوق کا کوئی جواب ہو نہ سکا

یہی ہے اشک تلون مزاجیوں کا مآل

کہ عشق میں تو کبھی کامیاب ہو نہ سکا

کوشش یہ ہے کہ ایک نیا راستہ بنے

چلتے ہیں ہٹ کے رہگذر کارواں سے ہم

پیچھے بہت ہے قافلۂ رہروانِ شوق

آگے بہت ہیں سرحدِ عمرِ رواں سے ہم

میخانۂ شباب کی کھینچی ہوئی شراب

پیتے ہیں بزم نازِ چشمِ بتاں سے ہم

کیا خبر تھی بزم میں اس کی نوائے دل بھی اشک

بند دروازے پہ سائل کی صدا ہو جائے گی

جام اس کا تھا شراب اس کی تھی محفل اس کی

اشک کچھ سوچ کے ساقی سے تقاضا کرتے

نذرِ عقیدت

ہے ساون کا مہینہ جوش پر ہے بزم رندانہ
جمائی پر جمائی لے رہا ہے قلب دیوانہ
شفق کی ہے ادھر لالی ادھر کھیتوں کی ہریالی
فضا رنگیں، گھٹا کالی، الا یا پیر میخانہ

اٹھا سجدے سے سر جھکی چلی آتی ہیں کاشی سے
گھٹائیں دوش پر اپنے لئے فطرت کا خمخانہ

جنوں کا راز رسوا ہے نمو کا فتنہ برپا ہے
تماشہ ہے کہ اٹھتی ہے نظر بے اختیارانہ
جھکی آتی ہیں یوں کالی گھٹائیں سبز کھیتوں پر
ہوا سے جس طرح ڈھلکے ردائے سبز جانانہ۔

بھری برسات موسم کی جوانی عقل دیوانی
ہوا مخمور و مستانی ہر اک جھونکا ہے مستانہ
فضائیں بہکی جاتی ہیں ہوائیں بہکی جاتی ہیں
دعائیں بہکی جاتی ہیں عجب موسم ہے رندانہ
گھروں سے کرشن جی کی گوپیاں نکلی ہیں یوں باہر
زمیں سے کونپلیں جس طرح پھوٹیں بے حجابانہ
جوانی اور اس کی دلربا رنگینیاں توبہ!
ادائیں بے قرارانہ نگاہیں شرمسارانہ
سلونی سانولی صورت پہ بل کھائی ہوئی زلفیں
وہ زلفیں دیکھ کر زنجیر توڑے جن کو دیوانہ
نظر میں سادگی، آنکھوں میں کاجل مانگ میں صندل
وہ گھن زلفوں کا ہے جس کی سیاہی قسمت شانہ

وہ شوخی آنکھ میں جو کر سکے تخلیق افسوں کی
وہ سرخی ہونٹ پر جو بن سکے عنوان افسانہ

جھکی آنکھیں، جھکی آنکھوں میں اک ترکیب خود داری
کھنچے ابرو کھنچاؤ میں بھی اک انداز ترکانہ

مئے رنگیں ٹپکتی دیکھ کر متوالی آنکھوں سے
نظر میں میکشوں کے پھر گئی تصویر میخانہ

وہ آنکھیں جن میں اٹھتی ہیں نشیلی مدھ بھری موجیں
وہ آنکھیں جن کو کہئے بادۂ گلگوں کا پیمانہ

وہ آنکھیں جن میں آ کر مل گئی کیفیت موسم
وہ آنکھیں جن میں جا کر چھپ گئے اسرار میخانہ

غرض جو نشو نمو بن کر چمن کی آبرو بن کر
وہ پریاں جھومتی آئیں بنا گلشن پریخانہ

وہ کیسا آئین کہ آئی اک نئی دنیا امنگوں کی
بنا "سندر نگر" گلشن کہ جو اب تک تھا ویرانہ

کسی کا فراوانے تار سے شاخوں کو جنبش دی
گرے یوں پھول جیسے شمع پر گرتا ہے پروانہ

جو دل سینوں میں اچھلے ہر طرف ڈالے گئے جھولے
جوانی کی امنگیں بن گئیں شوخیٔ طفلانہ

بڑھے پینگ اس طرح دھانی دوپٹوں کی ہوا دونہیں
محبت کی نظر جیسے بڑھے بے اختیارانہ

ہوئیں چہلیں، کھلے جوڑے، ڈھل آیا نا کمر آنچل
ہوا سنکی، لگیں گانے کسی کے دل کا افسانہ

کسی موسم کی ماری نے الاپے ساونی دوہے
کسی کافر نے وحشت کی غزل چھیڑی حریفانہ

وہ وحشت ساحر بنگالہ وحشت فتنہ گر وحشت

ہیں جس کے سحر کے چرچے حرم سے تا بہ بتخانہ

وہ وحشت وہ سخن پرداز وحشت جس کے جادو نے

کیا دیوانوں کو فرزانہ، فرزانوں کو دیوانہ

وہ وحشت جانتا ہے جو رموز عشق روحانی

وہ وحشت جس کی غزلیں ہیں دل عاشق کا افسانہ

وہ وحشت جس کو "میر کاروان شاعری" کہئے

وہ وحشت جس نے میخواروں پہ کھولے راز میخانہ

وہ وحشت جس کو دنیا "طوطی بنگال" کہتی ہے

بعنوان غزل کہتا ہے جو فطرت کا افسانہ

زباں پر مدحت پیر مغاں بے ساختہ آئی

کہاں ہے میرے ساقی کھول بھی دے باب میخانہ

ابھی ساقی نے کھولا بھی نہیں ہے باب میخانہ
ابھی سے اشک کی آنکھوں میں ہے اک کیف رندانہ

گلستاں مست غنچے مست بلبل مست ہے ساقی
قسم ہے تجھکو مستی کی لٹا دے آج میخانہ

نظر کی چوٹ کاری ہے دلوں پر حزن طاری ہے
مقام رستگاری ہے عطا ہو کوئی پیمانہ

وہ مئے دے جس کو پی کر ہو وہ احساس خودی پیدا
کہ جذب دل مشیت سے الجھ جائے حریفانہ

قسم صہبا پرستی کی قسم غم ہائے ہستی کی
وہ مئے دے جس کی تلخی سے پگھل جانا ہو پیمانہ

وہ مئے دے جس کی کیفیت میں راز ہوشیاری ہو
کہ کہنا ہے سر محفل حریم دل کا افسانہ

سناؤ اک نیا مطلع بہ مدح غالب ثانی

بطرز عرفیِ شیراز با آداب رندانہ

ترے اشعار میں وحشت ہے وہ تاثیر رندانہ

تڑپ جاتے ہیں متوالے، چھلک جاتا ہے پیمانہ

تری شان فقیری پر تصدق داب شاہانہ

دلوں پر بادشاہی کر رہا ہے تو فقیرانہ

تری شمع ہدایت سے چراغ شاعری روشن

ترے سوز محبت سے مکمل ذوق پروانہ

ترے جام سخن میں بادۂ عرفان شیرازی

ترے رنگ غزل میں شوخیٔ اسرار میخانہ

کجا رنگ سخن تیرا کجا رنگینیٔ گلشن!

کجا کیف غزل تیرا کجا ساقی کا پیمانہ

تری جادو بیانی سے خجل ترچھی نظر والے!
حسینوں کے لئے دیوان تیرا آئینہ خانہ

تری فکر رسا نے عرش سے توڑے ہیں وہ تارے
کہ ہے عقد ثریا سر بزانو شرمسارانہ

ترے اشعار رنگیں سے حسینوں نے ادا سیکھی
ادا سیکھی وفا سیکھی چلیں چوٹیں حریفانہ

تری آتش زبانی نے لگادی آگ گلشن میں
ترا کیف تغزل چھا گیا میخانہ میخانہ

شراب تند نے تیری دلوں میں میکدے کھولے
مئے تاثیر تیری بٹ گئی پیمانہ پیمانہ

ترے مینائے رنگیں سے چرائی مئے حریفوں نے
پلاتے ہیں سر محفل بنے ہیں پیر میخانہ

پریشاں تھے جو گیسو وہ سنوارے تیرے ہاتھوں نے
غلط ہے "گیسوئے اردو نہیں منت کش شانہ
قصیدہ ختم کرتا ہے دعا پر اس لئے احسن
کہیں ستی نہ بن جائے یہ کیف خاص رندانہ
بسر ہو زندگی تیری ہمیشہ عیش و عشرت میں
رہے سر پہ مریدوں کے ترا سایہ کریمانہ
نہ مرجھائیں کبھی کلیاں ترے گلزار معنی کی
نگاہ شوق گل چیں کی بھرے جھولی حریصانہ

ربانی پریس

نمبر ۳۴ کولن اسٹریٹ کلکتہ

کو

ہمیشہ یاد رکھیے

یہاں بہترین کتابت اور

عمدہ طباعت کے علاوہ ہر قسم کا

رنگین کام آفسٹ اور لیتھو میں کیا جاتا ہے

منیجر